علم کی قیمت

جناب عبدالرحمٰن انتولے (بیرسٹرایٹ لا، اورسابق چیف منسٹر مہاراشٹر) نے ۵ فروری ۱۹۸۷ کی ملاقات میں ایک واقعہ بتایا۔ غالباً ۱۹۵۴ کی بات ہے۔ اس وقت وہ لندن کی کونسل آف لیگل ایجوکیشن میں قانون کے طالب علم تھے۔ ایک لکچر کے دوران ایک قانونی مسئلہ کی وضاحت کرتے ہوئے ان کے انگریز پروفیسر نے انھیں یہ واقعہ سنایا تھا۔

پروفیسر نے بتایا کہ ایک بڑا صنعتی کارخانہ چلتے چلتے اچانک بند ہو گیا۔ کارخانہ کے انجنیر اس کو دوبارہ چلانے کی کوشش میں کامیاب نہ ہو سکے۔ آخر ایک بڑے اکسپرٹ کو بلایا گیا۔ وہ آیا تو اس نے کارخانہ کا ایک راونڈ لیا۔ اس نے اس کی مشینیں دیکھیں۔ اس کے بعد وہ ایک جگہ رک گیا۔ اس نے کہا کہ ایک ہتھوڑا لے آؤ۔ ہتھوڑا لایا گیا تو اس نے ایک مقام پر ہتھوڑے سے مارا۔ اس کے بعد مشین حرکت میں آگئی اور کارخانہ چلنے لگا۔

مذکورہ اکسپرٹ نے واپس جا کر ایک سو پونڈ کا بل بھیج دیا۔ کارخانہ کے منیجر کو یہ بل بہت زیادہ معلوم ہوا۔ اس نے ایکسپرٹ کے نام اپنے خط میں لکھا کہ آپ نے تو کوئی کام کیا نہیں، یہاں آکر آپ نے صرف ایک ہتھوڑا مار دیا۔ اس کے لیے ایک سو پونڈ کا بل ہماری سمجھ میں نہیں آیا۔ براہِ کرم آپ ہمارے نمائندہ کو مزید اور زیادہ بہتر تفصیلات عطا فرمائیں:

Please furnish my client with further and better particulars.

اس کے جواب میں مذکورہ اکسپرٹ نے لکھا کہ میں نے جو بل روانہ کیا تھا وہ بالکل صحیح ہے۔ اصل یہ ہے کہ ۹۹ پونڈ اور ۱۹ شلنگ تو یہ جاننے کے لیے ہیں کہ مشین میں غلطی کیا ہے اور کہاں ہے۔ اور ایک شلنگ ہتھوڑا اٹھا کر مارنے کے لیے:

£ 99.19 to diagnose the disease and one shilling to
pick up the hammer and to strike at the right spot.

اس دنیا میں سب سے زیادہ قیمت علم کی ہے۔ اسی طرح آخرت میں سب سے زیادہ قیمت معرفت کی ہوگی۔ جو شخص معرفت خداوندی میں جتنا بلند ہوگا اتنا ہی وہ آخرت میں بلند کیا جائے گا۔

کامیابی کاراز

ڈاکٹر سی وی رمن (۱۹۷۰ - ۱۸۸۸) ہندستان کے مشہور ترین سائنس داں ہیں۔ ۲۸ فروری ۱۹۲۸ کو انھیں فزکس کا نوبل انعام ملا۔ اس کے بعد وہ عالمی شہرت کے مالک ہو گئے۔ ان کی سائنسی دریافت رمن ایفکٹ (Raman Effect) آج سائنس کے مسلمات میں شمار ہوتی ہے۔ رمن ایک معمولی گھرانے میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد دس روپیہ ماہوار پر اسکول ٹیچر تھے۔ انھوں نے انتہائی مشکل حالات میں اپنی غیر معمولی محنت کے ذریعہ علم کی دنیا میں اپنا موجودہ مقام حاصل کیا۔ انھوں نے اپنی کامیابی کے سفر کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے —— شکست، مایوسی، محنت اور ہر قسم کے دکھ کی ایک لمبی تاریخ :

A long history of frustration, disappointment, struggle and every kind of tribulation.

ایک شخص نے رمن کی علمی کامیابی کو گھٹانے کے لیے کہا کہ آپ اپنی دریافت تک محض اتفاق کے ذریعہ پہونچے ہیں، جیسا کہ اکثر دوسرے سائنس داں بھی محض اتفاق کے ذریعہ اپنی دریافتوں تک پہونچے۔ رمن نے اس کو سن کر سنجیدگی کے ساتھ کہا :

The idea that a scientific discovery can be made by accident is ruled out by the fact that the accident, if it is one, never occurs except to the right man.

یہ تصور کہ سائنسی دریافت اتفاق کے ذریعہ حاصل کی جا سکتی ہے، اس حقیقت کی بنا پر خارج از بحث ہے کہ اتفاق، اگر واقعۃً پیش آئے، تو وہ کبھی ایک صحیح آدمی کے سوا کسی اور کے ساتھ پیش نہیں آتا۔ ڈاکٹر رمن نے اپنی زندگی کی آخری دریافت کا خلاصہ ان الفاظ میں بیان کیا ہے :

The right man, right thinking, right instruments, and right results.

صحیح آدمی، صحیح فکر، صحیح آلات، اور پھر صحیح نتیجہ۔ (ہندستان ٹائمس، ۱ جنوری ۱۹۸۷)

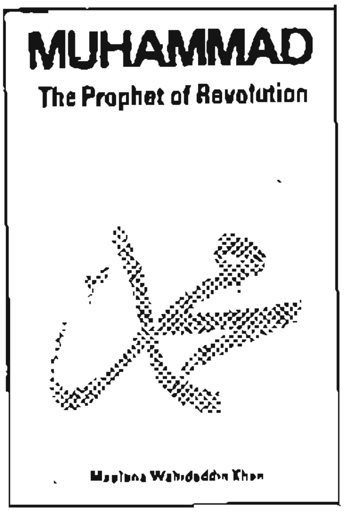

MUHAMMAD

The Prophet of Revolution

By

Maulana Wahiduddin Khan

In making the Prophet Muhammad the greatest figure, and consequently one of the most resplendent landmarks in human history, God has bestowed his greatest favour on mankind. Whoever seeks guidance cannot fail to see him, for he stands out like a tower, a mountain on the horizon, radiating light like a beacon, beckoning all to the true path. It is inevitable that the seekers of truth will be drawn up to the magnificent pinnacle on which he stands.

ISBN 81-85063-00-1 (PB Rs 50 $ 5)
ISBN 81-85063-07-9 (HB Rs 90 $ 9)

Maktaba Al-Risala
C-29 Nizamuddin West New Delhi-110013

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اردو، انگریزی میں شائع ہونے والا

الرسالہ

اسلامی مرکز کا ترجمان

شمارہ ۱۲۵ اپریل ۱۹۸۷

فہرست

	صفحہ		صفحہ
دو نمونے	۲	دین میں غلو	۱۸
عبرت ناک	۳	فیض بقدر استعداد	۱۹
دعوت کے آداب	۴	ذہنی ارتکاز	۲۰
علم کی قیمت	۵	یک طرفہ اقدام کی ضرورت	۲۱
دریافت کا طریقہ	۶	کم سمجھنا	۲۳
کامیابی کا راز	۷	بامعنی کائنات	۲۴
دوسروں کے ذمہ	۸	یہودی کردار	۲۶
ایک مشورہ	۹	یہ فرق کیوں	۲۷
ملّت کی کہانی	۱۰	ایک سفر	۲۹
دعوتی عمل	۱۳	دین سے دور	۴۴
اتحادِ ملّت	۱۶	خبرنامہ اسلامی مرکز	۴۵
خاموشی ضروری ہے	۱۷	ایجنسی ایک پروگرام	۴۸

عبرت ناک

مسلمان اسپین میں ۹۲ھ میں داخل ہوئے اور وہاں حکومت قائم کی۔ آٹھ سو سال تک با اقتدار رہنے کے بعد ۸۹۷ھ میں وہاں سے ان کی حکومت کا خاتمہ ہو گیا۔ اس لمبی مدت کا بڑا حصہ عیسائی طاقتوں سے لڑنے میں گزرا۔ آخری دور میں مسلمانوں کی حکومت غرناطہ کے محدود علاقہ میں رہ گئی تھی۔ اور اسپین کے وسیع حصہ پر فرڈینینڈ دوم (۱۵۱۶-۱۴۵۲) کی حکومت قائم تھی۔

۸۷۰ھ میں سلطان ابوالحسن غرناطہ کے تخت پر بیٹھا۔ اس وقت سلطنت غرناطہ کا رقبہ کم ہو کر صرف چار ہزار مربع میل باقی رہ گیا تھا۔ جب کہ شاہ فرڈینینڈ کی حکومت کا رقبہ تقریباً سوا لاکھ مربع میل تک پھیلا ہوا تھا۔ فرڈینینڈ نے مطالبہ کیا کہ سلطان ابوالحسن اس کو خراج دینا منظور کرے۔ سلطان ابوالحسن نہایت بہادر آدمی تھا۔ اس نے عیسائی بادشاہ کو جواب میں لکھا کہ: "غرناطہ کے دارالضرب میں اب سونے چاندی کے سکے ڈھلنے کے بجائے لوہے کی تلواریں تیار ہو رہی ہیں تاکہ تم عیسائیوں کی گردنیں ماری جائیں"۔ اس کے بعد دونوں بادشاہوں میں جنگ چھڑ گئی۔ سلطان ابوالحسن نے ان جنگوں میں بار بار شاہ فرڈینینڈ کو شکست دی۔ تاہم آخری فتح فرڈینینڈ کو ہوئی۔

اس کا سب سے بڑا سبب خود سلطان ابوالحسن کا بیٹا ابو عبداللہ محمد تھا۔ ۲۷ جمادی الاول ۸۸۷ھ کو لوشا کے میدان میں سلطان ابوالحسن نے فرڈینینڈ کی فوجوں کو زبردست شکست دی۔ مگر جب وہ دشمن کو شکست دے کر واپس ہوا تو معلوم ہوا کہ اس کے بیٹے ابو عبداللہ محمد نے غرناطہ پر قبضہ کر کے اپنی خود مختاری کا اعلان کر دیا ہے۔ اس کے بعد سلطان اور باغی شہزادے میں جنگ ہوتی رہی۔ یہاں تک کہ وہ وقت آیا کہ ۲ جنوری ۱۴۹۲ء (۸۹۷ھ) کو عیسائی بادشاہ نے آخری طور پر سلطنت غرناطہ پر قبضہ کر لیا۔

مسلمانوں کو ماضی میں جتنی شکستیں ہوئی ہیں، سب آپس کے اختلافات کے نتیجہ میں ہوئی ہیں۔ مگر تاریخ اسلام کا یہی وہ سب سے بڑا واقعہ ہے جو موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کو سب سے کم معلوم ہے۔ ماضی کی طرح آج بھی وہ اسی طرح آپس میں لڑ رہے ہیں جیسے کہ انھوں نے اپنے ماضی سے کچھ سبق نہیں سیکھا۔

ایک مشورہ

یوسف اسلام ایک انگریز نومسلم ہیں۔ ان کا پچھلا نام کیٹ اسٹونس (Cat Stevens) تھا۔ ۱۹۷۷ میں انھوں نے لندن کی ایک مسجد میں اسلام قبول کیا۔

لندن کے انگریزی ماہنامہ دی مسلم (مئی۔ جون ۱۹۸۰) میں یوسف اسلام صاحب کا ایک انٹرویو شائع ہوا ہے۔ انٹرویو لینے والے شخص نے ان سے پوچھا کہ انگلینڈ کے اخبارات مسلسل اسلام کے خلاف پروپیگنڈا کرتے رہتے ہیں، اس کا حل کیا ہے۔ یوسف اسلام صاحب نے جواب دیا: لوگ اتنے نادان نہیں ہیں کہ ہر چیز جو اخبار میں چھپے اس پر یقین کریں۔ لوگ اپنی رائیں خود بناتے ہیں۔ تاہم اگر وہ مسلمانوں کو مذکورہ برائی میں ملوث دیکھیں گے تو عین ممکن ہے کہ وہ اخبار کی رپورٹ پر یقین کریں۔

حقیقت یہ ہے کہ اصل چیز صورت واقعہ ہے نہ کہ اخبار کی خبر۔ اگر مسلمانوں کی عمومی زندگی اس سے مختلف ہو جو اخبار میں کسی "دشمن اسلام" نے چھاپی ہے تو کوئی بھی پڑھنے والا اس کو کسی قسم کی اہمیت نہیں دے گا۔ مثلاً اگر کوئی شخص اپنے اخبار میں یہ چھاپے کہ ہندستان میں جہالت کی شرح سب سے زیادہ عیسائیوں میں ہے۔ پارسیوں میں سب سے زیادہ فقیر ہوتے ہیں۔ سردار قوم سب سے زیادہ بزدل قوم ہے، تو اس قسم کی باتوں سے کوئی بھی اثر نہیں لے گا۔ کیوں کہ یہ باتیں معلوم واقعات کے سراسر خلاف ہیں۔

اسی طرح اگر لوگوں کی نظر میں مسلمانوں کی تصویر اچھی بن جائے تو ان کے بارہ میں لوگوں کے برے بیانات اپنے آپ بے اثر ہو کر رہ جائیں گے۔

اگر لوگوں کی نظر میں مسلمانوں کی عملی تصویر یہ ہو کہ وہ حقیقت پسند ہوتے ہیں۔ وہ آپس میں متحد رہتے ہیں۔ وہ لین دین میں بے انصافی نہیں کرتے۔ وہ ذرا ذرا سی بات پر مشتعل نہیں ہوتے۔ وہ انسان کی جان و مال اور عزت کا احترام کرتے ہیں۔ اگر آج لوگوں کے نزدیک مسلمان ہونے کا مطلب یہ بن جائے تو لوگ اخبارات کی مخالفانہ سرگرمیوں کو کوئی اہمیت نہ دیں گے۔ وہ اس قسم کی رپورٹوں اور خبروں کو اتنا غیر اہم سمجھیں گے کہ سرخی دیکھنے کے بعد شاید وہ اس کا مطالعہ بھی نہ کریں

وہ اللہ کے یہاں غضب کے مستحق ہوتے ہیں نہ کہ رحمت ونصرت کے مستحق۔

لارڈ لوتھین کی مذکورہ تجویز پر عمل کرنے کے لیے انگریزی دانی کی ضرورت تھی، اس لیے عام مسلم رہنماؤں کے لیے یہ عذر ہو سکتا ہے کہ وہ انگریزی نہیں جانتے تھے۔ مگر اللہ تعالیٰ نے یہاں ایک اور دعوتی موقع پیدا کیا تھا، اور اس موقع کو استعمال کرنے کے لیے اپنی مادری زبان ہی کافی تھی۔ مگر یہاں بھی ہمارے رہنما صد فی صد ناکام رہے۔

یہ امکان نوآبادیاتی نظام نے پیدا کیا تھا۔ یورپ کی قومیں جدید طاقت کے زور پر ساری دنیا میں پھیل گئیں۔ اور جگہ جگہ انھوں نے اپنا اقتدار قائم کیا۔ اس قسم کے لوگ خود اپنی ضرورت اور مصلحت کے تحت ہر جگہ کی مقامی زبان بھی سیکھتے تھے۔ مثلاً جو انگریز اس زمانہ میں ہندستان آئے انھوں نے یہاں کی مقامی زبان بھی سیکھی اور یہ حیثیت اس زمانہ میں جس زبان کو حاصل تھی وہ اردو زبان تھی۔

جن ہندستانیوں کی عمریں پچاس سال سے اوپر ہیں وہ بخوبی طور پر اس واقعہ کو جانتے ہیں کہ ۱۹۴۷ کے انقلاب سے پہلے ہندستان میں سب سے زیادہ بولی اور سمجھی جانے والی زبان اردو تھی۔ تاہم جو لوگ بعد کے زمانہ کی پیداوار ہیں، ان کے سمجھنے کے لیے یہاں میں ایک حوالہ نقل کرتا ہوں۔ انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا (۱۹۸۴) نے اردو زبان (Urdu Language) کے تحت جو کچھ لکھا ہے اس میں سے ایک بات یہ ہے کہ ۱۹۴۷ کی ملکی تقسیم سے پہلے اردو زبان شمالی ہند کی عمومی طور پر بولی جانے والی زبان تھی جو اس وقت ہندستانی یا کھڑی بولی کہی جاتی تھی:

> The spoken language, referred to before the 1947 partition as Hindustani or Khari Boli, was the lingua franca of northern India (X/297).

ایک واقعہ

میجر جنرل اجیت انیل رد را ۱۹۱۵ میں ہندستانی فوج میں داخل ہوئے۔ اب ان کی عمر ۹۰ سال ہو چکی ہے۔ ٹائمس آف انڈیا (۱۵ اکتوبر ۱۹۸۶) کے ایک اسٹاف رپورٹر سے بات چیت کرتے ہوئے انھوں نے پچھلے زمانہ کی اپنی بہت سی یادداشتیں بتائیں۔ انھوں نے

اس سلسلے میں جو واقعات بتائے ان میں سے ایک واقعہ یہ تھا۔

۱۹۴۷ سے پہلے جب وہ فوج کی باقاعدہ سروس میں تھے تو فیض احمد فیض بھی ان کے تحت کام کرتے تھے۔ فیض کا تعلق فوج کے رابطۂ عامہ (Public relations) کے شعبہ سے تھا۔ ایک بار فیض کے ذمہ یہ کام سپرد ہوا کہ وہ اس وقت کے وائسرائے لارڈ ماؤنٹ بیٹن کی تقریر کا ہندستانی زبان میں ترجمہ کریں۔ فیض نے ترجمہ کر کے بھیج دیا۔ اس کے بعد فیض احمد فیض اور میجر جنرل ردرا دونوں وائسریگل لاج (راشٹرپتی بھون) بلائے گئے تاکہ وہ ادائیگی الفاظ کے معاملہ میں وائسرائے کی رہنمائی کرسکیں۔ اس کے بعد میجر جنرل ردرا کے الفاظ یہ ہیں:

> When Faiz and myself called on the Viceroy to help him with the diction, Mountbatten was pacing up and down his room in the now christened Rashtrapati Bhawan rehearsing his speech. He was speaking Hindustani quite well, much to our surprise.

جب فیض احمد فیض اور میں وائسرائے کی ملاقات کے لیے گئے تاکہ الفاظ کی ادائیگی کے معاملہ میں ان کی مدد کریں، تو ماونٹ بیٹن اپنے موجودہ راشٹرپتی بھون کے کمرہ میں اِدھر سے اُدھر چل رہے تھے اور اپنی تقریر کو دہرا رہے تھے۔ اس وقت وہ بالکل صاف ہندستانی بول رہے تھے۔ یہ دیکھ کر ہم کو سخت تعجب ہوا۔

یہ واقعہ ۱۹۴۷ سے پہلے اس دور کی یاد دلاتا ہے جب کہ ملک میں ہندستانی (یا اردو) کا غلبہ تھا۔ ملک کے اعلیٰ ترین حکام بھی اردو اور ہندستانی کو بولتے اور سمجھتے تھے۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ ہندستان کی اردو بولنے والی قوم اور حکمرانوں کے درمیان زبان کا وہ فاصلہ (Language gap) موجود نہ تھا جو آج پایا جارہا ہے۔ اس بات کو یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ اس وقت داعی کی جو زبان تھی وہی مدعو کی زبان بھی تھی۔ مگر کیسی عجیب بات ہے کہ داعیوں کے گروہ نے اس امکان کو ایک فیصد بھی استعمال نہیں کیا۔ تاریخ بتاتی ہے کہ ہمارے لیڈروں نے اس زمانہ میں ان حکمرانوں سے بے شمار ملاقاتیں کیں۔ مگر یہ تمام لیڈران حکمرانوں سے صرف مانگنے کے لیے ملتے تھے نہ کہ انھیں دینے کے لیے۔ وہ یہی کرتے رہے یہاں تک کہ وہ دور ختم ہوگیا جس میں اردو زبان نے عوامی اہمیت حاصل کی تھی۔

دعوتی عمل

"اس جزیرہ میں تو صرف مگرمچھ اور سانپ اور کھنکھجورے ہیں" مسیحی سیاح نے اپنی سیاحت سے واپس آکر مسیحی مشنری کو رپورٹ دی۔

"خیر انھیں ہونے دو، یہ بتاؤ کہ کیا وہاں کچھ انسان بھی ہیں"

"ہاں، ہیں کیوں نہیں۔ مگر ایسے وحشی اور خونخوار ہیں کہ ان کے درمیان قدم رکھنے کا تو خیال بھی نہ کیجیے"

"بس معلوم ہوگیا۔ اتنی اطلاع کافی ہے۔ انسان جہاں کہیں بھی آباد ہیں، مشنری کا وہاں پہونچنا ضروری ہے"

یہ خلاصہ ہے اس گفتگو کا جو ایک مسیحی سیاح اور لندن مشنری سوسائٹی کے ایک ذمہ دار کے درمیان ۱۸۷۱ میں جزیرہ نیو گنی کے جنوبی ساحل پر ہوئی۔ اس کے بعد جزیرہ میں مشنری کا کام شروع ہوگیا۔ اور اب اس گفتگو کے سو برس بعد جزیرہ نہ صرف مہذب ہو چکا ہے بلکہ اس کی بیشتر آبادی عیسائی ہے۔ دو ہزار برس پہلے مسیحؑ اس دنیا سے گئے تو ان کے پیچھے صرف ایک درجن عیسائی تھے۔ مگر مسلسل تبلیغ کے نتیجہ میں آج عیسائیوں کی تعداد تمام مذاہب میں سب سے زیادہ ہے۔ عیسائیوں کے تبلیغی ادارے اتنے منظم ہیں اور اتنے وسیع پیمانہ پر کام کر رہے ہیں جس کی کوئی دوسری مثال ساری انسانی تاریخ میں نہیں ملتی۔

اس کے برعکس مسلمانوں پر ان کے پیغمبر نے یہ ذمہ داری ڈالی تھی کہ وہ قیامت تک ساری قوموں تک اسلام کا پیغام پہونچاتے رہیں۔ مگر پیغمبر اسلام کے ابتدائی پیرووں کے بعد یہ کام تقریباً بند ہوگیا۔ بلاشبہ اسلام بعد کی صدیوں میں بھی پھیلتا رہا ہے۔ مگر وہ زیادہ تر خود اپنے زور پر پھیلا ہے۔ ورنہ مسلمانوں کا محبوب ترین مشغلہ جس میں وہ موجودہ سائنٹفک دور میں بھی انتہائی انہماک کے ساتھ لگے ہوئے ہیں، وہ جنگ وجدل اور سیاسی معرکہ آرائی ہے۔ اس کے سوا کوئی اور چیز انھیں کام ہی نظر نہیں آتی جس میں وہ اپنے آپ کو مشغول کریں۔ اس عموم میں بعض استثنار ضرور ہے۔ مگر وہ استثنار اصاغر کا ہے نہ کہ اکابر کا۔

اتحادِ ملّت

اتحاد کیا ہے۔ اتحاد نام ہے اختلاف کے باوجود متحد ہونے کا۔ موجودہ دنیا میں کوئی گروہ اختلافِ فکر سے خالی نہیں ہو سکتا۔ اس لیے موجودہ دنیا میں کسی گروہ کے اندر اتحاد صرف اس وقت پیدا ہو سکتا ہے جب کہ وہ اختلاف کے باوجود متحد ہونا جانتا ہو۔

یہی وجہ ہے کہ اتحاد ہمیشہ صبر کی زمین پر قائم ہوتا ہے۔ اتحاد صرف کسی ایسی قوم کے اندر ظہور میں آتا ہے جس کے اندر برداشت کی طاقت ہو۔ مسلمانوں نے موجودہ زمانہ میں صبر و برداشت کو کھو دیا ہے، اس لیے وہ اتحاد کو بھی کھوئے ہوئے ہیں۔

مسلمانوں کو بے برداشت بنانے کے اصل ذمہ دار مسلمانوں کے عین وہی رہنما ہیں جو مسلمانوں کو اتحاد کا پیغام دینے میں سب سے آگے نظر آتے ہیں۔ ایک رہنما جب اپنے خلاف تنقید سن کر مشتعل ہو جاتا ہے تو وہ اپنے اس عمل سے لوگوں کو بے برداشت ہونے کا سبق دے رہا ہے۔ ایک رہنما جب کسی مسلم حکمراں کی "غلطی" کو دیکھ کر بھڑ اٹھتا ہے اور اس کے خلاف ہنگامہ آرائی شروع کر دیتا ہے تو عین اسی وقت وہ قوم کو بے برداشت بنا رہا ہوتا ہے۔ ایک رہنما جب غیر قوم کے جلوس پر پابندی لگانے کا مطالبہ کرتا ہے تو اسی کے ساتھ وہ قوم کو بے برداشت بنانے میں بھی اپنا حصہ ادا کر رہا ہوتا ہے۔ وغیرہ

ہمارے رہنما ہر روز اپنے عمل سے اسی قسم کے نمونے پیش کر رہے ہیں۔ وہ ہر اختلافی بات پر پرجوش ردعمل ظاہر کرنے کے لیے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اس طرح وہ مسلسل قوم کو یہ سبق دے رہے ہیں کہ کسی خلافِ مزاج بات کو برداشت نہ کرو، ہر چیز جو تمہیں پسند نہ آئے اس کے خلاف جھنڈا لے کر کھڑے ہو جاؤ۔

حقیقت یہ ہے کہ اتحاد کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہمارے رہنماؤں کا یہی مزاج ہے۔ ان کا یہ مزاج مسلمانوں کو بے صبری کی تربیت دے رہا ہے۔ اور بلاشبہ بے صبری ہی اتحاد کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے —— ہر چیز کی ایک قیمت ہوتی ہے اور اتحاد کی بھی ایک قیمت ہے۔ یہ قیمت ہے خلافِ اتحاد باتوں کو برداشت کرنا۔

خاموشی ضروری ہے

ایک روایت کے مطابق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص اللہ پر اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتا ہو تو اس کو چاہیے کہ بھلی بات بولے ورنہ چپ رہے (من کان یومن باللّٰہ والیوم الآخر فلیقل خیرا او لیصمت)

حقیقت یہ ہے کہ چپ رہنا بھی اتنا ہی اہم ہے جتنا کہ بولنا۔ بعض مواقع ایسے ہوتے ہیں جہاں بولنا انتہائی ضروری ہوتا ہے اس لیے اس شخص کو گونگا شیطان (شیطان اخرس) کہا گیا ہے جو بولنے کے موقع پر نہ بولے مگر اسی کے ساتھ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ بعض مواقع ایسے ہوتے ہیں جب کہ چپ رہنا ہی زیادہ صحیح اور ضروری ہے۔

خاموشی کے ضروری ہونے کی ایک مثال غزوۂ احد کا واقعہ ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم زخمی ہوگئے تھے اور ایک غار میں لوگوں کی نگاہوں سے پوشیدہ تھے۔ یہاں تک کہ دشمنوں نے اعلان کر دیا کہ محمدؐ قتل کر دیئے گیے۔ صحابہ پر سراسیمگی چھاگئی۔ اس دوران ایک صحابی کی نظر آپ پر پڑی۔ وہ بول پڑے کہ رسول اللہ یہاں ہیں۔ اس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بولے بغیر اشارہ سے ان کو منع کیا کہ چپ رہو (اشار الیہ الرسول ان اصمت) اس کی ایک مثال وہ حدیث ہے جس میں کہا گیا ہے کہ اگر تم اپنے ساتھی سے کہو کہ چپ رہو، جب کہ امام خطبہ دے رہا ہو تو تم نے لغو فعل کیا (اذا قلت لصاحبك اسکت والامام یخطب فقد لغوت)

انفرادی مجالس میں بھی خاموشی کا یہ اصول ضروری ہے۔ مگر جب معاملہ قوم کا ہو تو اس کی اہمیت لاکھوں گُنا بڑھ جاتی ہے۔ کسی نازک موقع پر ایک رہنما کی خاموشی ایک بڑے فساد کو روکنے کا سبب بن جاتی ہے۔ اسی طرح ایک رہنما کی بے موقع تقریر ایک ایسا فساد برپا کر سکتی ہے جس میں سیکڑوں انسان مارے جائیں اور کروروں روپے کی جائداد جلا کر خاک کر دی جائے۔ اسی مفہوم میں سسٹر کنسولتا (Sister Consolata) نے کہا ہے کہ کسی قوم کی ناکامیوں کی سب سے زیادہ تعداد کا سبب خاموشی کے اصول کو توڑنا ہے:

The greatest number of failings in a community come from breaking the rule of silence.

فیض بقدر استعداد

حدیث میں ہے کہ تمہارے دین کی سب سے بہتر چیز تفقہ ہے (خیر دینکم الفقہ) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عبداللہ بن عباس کے لیے ان الفاظ میں دعا فرمائی: اللّٰھم فقّھہ فی الدّین وعلّمہ التاویل (خدایا، اس کو دین کی فہم عطا فرما اور اس کو تاویل کلام کی صلاحیت دے) بخاری و مسلم میں ایک روایت ان الفاظ میں آئی ہے:

عن ابی موسیٰ رضی اللہ عنہ عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال: إنّ مثل ما بعثنی اللہ بہ من الھدیٰ والعلم کمثل غیث اصاب ارضاً، فکانت منھا طائفۃ طیبۃ قبلت الماء فانبتت الکلأ والعشب الکثیر... وکان منھا اجادب امسکت الماء فنفع اللہ بھا الناس... فشربوا منھا وسقوا وزرعوا.... واصاب طائفۃ منھا اخریٰ، انّما ھی قیعان لاتمسك ماء ولا تنبت کلأ ... فذالك مثل من فقہ فی دین اللہ ونفعہ ما بعثنی اللہ بہ فعلم وعلّم، ومثل من لم یرفع بذالك رأسا ولم یقبل ھدی اللہ الذی ارسلت بہ۔

حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ بتاتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ نے جس ہدایت اور علم کے ساتھ مجھے بھیجا ہے اس کی مثال ایک بارش کی ہے جو زمین پر برسے۔ اس کا ایک حصہ زرخیز تھا۔ اس نے پانی کو قبول کیا اور خوب گھاس اور سبزہ اُگایا۔ اور اس زمین کا ایک حصہ بنجر زمین ہو۔ اس نے پانی کو روکا تو اللہ نے اس سے لوگوں کو فائدہ پہونچایا۔ اور زمین کا ایک اور حصہ ڈھلوان تھا۔ وہ نہ پانی کو روکتا تھا اور نہ سبزہ اُگاتا تھا۔ پس یہی مثال اس شخص کی ہے جس نے اللہ کے دین میں سمجھ حاصل کی، اس بسے اس کو نفع ہوا۔ اس نے سیکھا اور سکھایا۔ اور (دوسری) مثال اس شخص کی ہے جس کو اس میں سے کوئی حصہ نہ ملا اور اس نے اس ہدایت کو قبول نہ کیا جس کے ساتھ میں بھیجا گیا ہوں۔

زمین کو بارش کا فائدہ اس کی استعداد کے بقدر ملتا ہے، یہی معاملہ انسان کا بھی ہے۔ خدا کی ہدایت تمام انسانوں کے لیے عام ہے۔ مگر جو شخص جتنی استعداد کا ثبوت دے گا اتنا ہی فائدہ اس کو حاصل ہوگا۔ اور سب سے بڑا فائدہ جو ہدایت الٰہی سے کسی کو ملتا ہے وہ معرفت ہے۔

یک طرفہ اقدام کی ضرورت

صلح حدیبیہ (۶ھ) تاریخ اسلام کا مشہور واقعہ ہے۔ اس موقع پر مخالفین اسلام نے صلح کی جو شرطیں پیش کیں، ان کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی بحث کے بغیر منظور کر لیا۔ یہ شرطیں سب کی سب مخالفینِ اسلام کے حق میں تھیں۔ چنانچہ جو مسلمان آپ کے ساتھ تھے ان کی اکثریت پر یہ صلح بے حد شاق گزری۔ حتی کہ بعض صحابہ یہ کہہ پڑے کہ کیا ہم حق پر نہیں ہیں۔ اور کیا فریق ثانی باطل پر نہیں ہے۔ اگر ہم حق پر ہیں اور فریق ثانی باطل پر ہے تو ہم اس قسم کی ذلت آمیز شرائط پر صلح کیوں کریں۔

پیغمبر اسلام اور عام مسلمانوں کے درمیان رائے کا یہ فرق کیوں ہوا۔ اس کو ایک لفظ میں اس طرح بیان کیا جا سکتا ہے کہ پیغمبر اسلام مسئلہ کو یک طرفہ طور پر دیکھ رہے تھے اور عام مسلمان دو طرفہ طور پر۔ عام مسلمانوں کا خیال تھا کہ کچھ ہم جھکیں اور کچھ وہ جھکیں۔ کچھ شرطیں ہماری مانی جائیں، کچھ شرطیں ان کی مانی جائیں۔ یعنی معاملہ کو دو طرفہ بنیاد پر طے کیا جائے۔ جب کہ پیغمبر اسلام کا خیال تھا کہ ہم اس بحث کو نہ چھیڑیں کہ اس معاملہ میں کون حق پر ہے اور کون ناحق پر۔ اس بحث سے صرفِ نظر کرتے ہوئے ہم یک طرفہ طور پر فریق ثانی کی پیش کی ہوئی شرطوں پر راضی ہو جائیں۔

مسلمانوں کی رائے خالص منطقی اعتبار سے بالکل درست تھی۔ نظری انصاف کے اعتبار سے یقیناً یہی ہونا چاہیے تھا کہ دونوں میں سے کوئی فریق ضد نہ کرے، بلکہ اصولی بنیاد پر جو بات صحیح ہے اس پر دونوں فریق راضی ہو جائیں۔

مگر پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم معاملہ کو عملی نقطۂ نظر سے دیکھ رہے تھے۔ آپ جانتے تھے کہ اگر اصول اور منطق کی بنیاد پر اصرار کیا گیا تو فریق ثانی ہرگز راضی ہونے والا نہیں ہے۔ اس لیے عملی اعتبار سے مسئلہ کا ممکن حل صرف یہ ہے کہ فریق ثانی کی شرطوں کو یک طرفہ طور پر مان لیا جائے۔ اس کا فوری فائدہ یہ ہوگا کہ دونوں فریقوں میں ٹکراؤ کی صورت حال ختم ہو جائے گی۔ اور مسلمانوں کے لیے کام کے مواقع نکل آئیں گے۔ دو طرفہ بنیاد پر اصرار عملاً دونوں فریقوں کے درمیان ٹکراؤ کو برقرار رکھنے کے ہم معنی تھا۔ جب کہ یک طرفہ بنیاد پر راضی ہونے کا مطلب یہ تھا کہ جنگی ٹکراؤ ختم

کم سمجھنا

زندگی نام ہے ناخوشگواریوں کو خوش گواری کے ساتھ قبول کرنے کا۔ تھیوڈور روز ویلٹ (Theodore Roosevelt) نے اسی بات کو ان الفاظ میں کہا کہ زندگی کا سامنا کرنے کا سب سے زیادہ ناقص طریقہ یہ ہے کہ حقارت کے ساتھ اس کا سامنا کیا جائے:

The poorest way to face life is to face it with a sneer.

اصل یہ ہے کہ اس دنیا میں کوئی شخص اکیلا نہیں۔ بلکہ اس کے ساتھ دوسرے بہت سے لوگ بھی یہاں زندگی کا موقع پائے ہوئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اپنے منصوبہ کے تحت ہر ایک کو اس کا سامانِ حیات دے رہا ہے۔ کسی کو ایک چیز، کسی کو دوسری چیز اور کسی کو تیسری چیز۔ ایسی حالت میں آدمی اگر دوسروں کو حقیر یا کم سمجھ لے تو وہ حقیقت پسندانہ نظر سے محروم ہو جائے گا۔ وہ نہ اپنے بارہ میں صحیح رائے قائم کر سکے گا اور نہ دوسروں کے بارے میں۔

تاریخ انسانی میں جو سب سے بڑا جرم کیا گیا ہے وہ عدم اعتراف ہے۔ تاریخ کے ہر دور میں خدا کے نیک بندے حق کا پیغام لے کر اٹھے، انھوں نے لوگوں کو سچائی کی طرف بلایا۔ مگر ہمیشہ ایسا ہوا کہ ان کے مخاطبین کی اکثریت نے ان کو نظر انداز کر دیا۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہی تھی کہ انھوں نے ان سچے انسانوں کو حقیر سمجھ لیا، صرف اس لیے کہ ان کے آس پاس انھیں دنیا کی رونقیں نظر نہ آئیں، وہ ان کو تختِ عظمت پر بیٹھے ہوئے دکھائی نہیں دیئے۔ انھوں نے کہا کہ ہم ایک چھوٹے آدمی کے سامنے کیوں اپنے آپ کو جھکائیں۔

یہی معاملہ قومی رویہ کا بھی ہے۔ اگر ہم ایک قوم کو حقیر سمجھ لیں تو اس کے بارے میں ہمارا پورا رویہ غلط ہو کر رہ جائے گا۔ ہم اس قوم کی اچھائیوں کو بھی برائی کے روپ میں دیکھنے لگیں گے، ہم اس قوم کی طاقت کا غلط اندازہ کریں گے اور اس سے ایسے مواقع پر غیر ضروری طور پر لڑ جائیں گے جہاں بہترین عقل مندی یہ تھی کہ اس سے اعراض کیا جائے۔

دوسروں کو کم سمجھنا باعتبار نتیجہ خود اپنے آپ کو کم سمجھنا ہے۔ دوسروں کو حقیر سمجھنے کا آخری انجام صرف یہ ہے کہ آدمی خود دوسروں کی نظر میں حقیر ہو کر رہ جائے۔

صاف گوئی پر خفا ہوگیے۔ اس وقت وہ ڈنر پر بیٹھے ہوئے تھے۔ شاہِ دکن نے اسی وقت ان کو ڈنر کی میز سے اٹھا دیا۔

نواب میر عثمان علی خاں نے اپنے ایک ماتحت کو کھانے کی میز سے اٹھا دیا۔ اگر انھیں معلوم ہوتا کہ بہت جلد وہ خود حکمرانی کی میز سے اٹھائے جانے والے ہیں تو وہ کبھی ایسا نہ کرتے۔ سرکشی کے تمام واقعات صرف اس لیے ہوتے ہیں کہ آدمی اپنے مستقبل سے بے خبر رہتا ہے۔ آدمی اگر اپنے مستقبل کو جانے تو وہ کبھی سرکشی نہ کرے۔

حیدر آباد کی تاریخ میں ایک نہایت اہم سبق ہے۔ ریاست کے دور میں یہاں وزیر اعظم کے عہدہ پر اکثر کوئی ہندو شخصیت ہوتی تھی۔ مثلاً ایک زمانہ میں مہاراجہ سرکشن پرشاد (وفات ۱۹۴۰) ریاست کے صدر اعظم تھے۔ وہ عربی، فارسی اور انگریزی زبانوں پر عبور رکھتے تھے۔ تاہم اس سے نیچے کی ملازمتوں میں عام طور پر مسلمان لیے جاتے تھے۔ اس زمانہ میں مسلمانوں کی معاش کا واحد سب سے بڑا ذریعہ سرکاری ملازمت ہی تھی۔

یہ صورت حال ریاست کے ہندوؤں کے لیے ڈِس ایڈوانٹج کی حیثیت رکھتی تھی۔ مگر یہ ڈِس ایڈوانٹج ان کے لیے ایڈوانٹج بن گیا۔ سرکاری ملازمت سے مایوس ہوکر انھوں نے تجارت کے میدان میں اپنی کوشش شروع کر دی۔ یہاں تک کہ وہ ریاست کی تقریباً پوری تجارت پر قابض ہوگیے۔ یہ مثال ظاہر کرتی ہے کہ ہر محرومی میں ایک نئی شاندار تر کامیابی کا پہلو موجود ہوتا ہے، بشرطیکہ آدمی اس کو دریافت کرے اور اس کی طرف اپنی زندگی کا سفر شروع کر دے۔

حیدر آباد کے سفر کا سب سے زیادہ عجیب واقعہ اس کا ایک چھوٹا سا واقعہ ہے۔ ۱۵ فروری کی شام کو میں باغ عامہ میں تقریر کر کے نکلا۔ لوگ مصافحہ کرنے کے لیے ہر طرف گھیرے ہوئے تھے۔ اتنے میں ایک نوجوان بھیڑ کو چیرتا ہوا میرے قریب آیا۔ اس نے پوچھا کہ آپ کے نزدیک آپ کی سب سے بہتر تصنیف کون ہے۔ میں نے کہا: میری سب سے بہتر تصنیف آپ ہیں۔ یہ انسان جو میرے سامنے کھڑا ہوا ہے، یہی میری سب سے بہتر تصنیف ہے۔ میرا یہ جواب سن کر وہ ایک لمحہ کے لیے چپ رہا، اس کے بعد بولا: جب آپ مجھ کو اپنی سب سے بہتر تصنیف

کہتے ہیں تو میں بھی اس تصنیف کو طبع کر کے دکھاؤں گا۔

یہ سن کر میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ میں نے کہا کہ خدایا، تو اس نوجوان کے الفاظ کو پورا کر، اور ایسی بہت سی زندہ تصنیفیں تیار کر دے جو میرے مشن کو لے کر چلیں اور میرے بعد اس کو آگے بڑھائیں۔

حیدر آباد میں قارئین الرسالہ کا کافی بڑا حلقہ ہے۔ ان لوگوں نے یہاں ایک خاص کام "بک اسٹال" کا شروع کیا ہے۔ وہ ہر ہفتہ میں کم از کم دو بک اسٹال ضرور لگاتے ہیں۔ ایک جمعہ کے دن جامع مسجد کے سامنے۔ دوسرا اتوار کے دن باغ عامہ کے ہفتہ وار جلسہ میں۔ یہ طریقہ نہایت مفید ہے۔ دوسرے مقامات کے لوگوں کو بھی اس کی تقلید کرنی چاہیے۔

ایک صاحب نے کہا کہ الرسالہ میں آپ کا سفرنامہ چھپتا ہے۔ اگر ہم سفرنامہ لکھیں تو کیا وہ الرسالہ میں چھپ سکتا ہے۔ میں نے جواب دیا کہ الرسالہ کا سفرنامہ دراصل سبق نامہ ہوتا ہے۔ اگر آپ بھی اسی طرح سبق نامہ لکھیں تو انشاراللہ وہ بھی شائع ہو جائے گا۔

مسٹر پریم مرارکا (صنعت کار) کو اپنے ایک مسلم دوست سے انگریزی الرسالہ ملا۔ وہ ان کو اتنا پسند آیا کہ وہ اس کے باقاعدہ قاری ہو گئے۔ وہ مجھ سے ملے تو انھوں نے بتایا کہ ان کے کئی ہم قوم افراد نے الرسالہ کو دیکھ کر کہا کہ اس کو ہمارے نام بھی جاری کر دو۔ چنانچہ ان کے ذریعہ کئی اور ہندو صاحبان الرسالہ انگریزی کے قاری بن گئے ہیں۔ مسٹر مرارکا نے کہا کہ الرسالہ کے پہلے پیج پر آپ دو سطر یا تین سطر کی جو بات لکھتے ہیں وہ ایسی ہوتی ہے کہ اس کو پڑھنے کے بعد آدمی اس سے رک نہیں سکتا کہ وہ آگے نہ پڑھے۔

مسٹر مہادیون ریڈی (حمایت نگر) پہلے ایک بڑے سرکاری عہدہ پر تھے۔ اب وہ ریٹائر ہو چکے ہیں۔ اردو زبان بخوبی جانتے ہیں۔ وہ الرسالہ کے باقاعدہ قاری ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ وہ تذکیر القرآن جلد اول کو پانچ بار پڑھ چکے ہیں اور اب اس کو چھٹی بار پڑھ رہے ہیں۔ تذکیر القرآن کی دوسری جلد کا انھوں نے شدت سے تقاضا کیا۔

مسٹر عزیز احمد خاں ایڈوکیٹ کی رہائش گاہ پر کئی اعلیٰ تعلیم یافتہ مسلمانوں کی مجلس ہوئی اس گفتگو کے دوران جو باتیں معلوم ہوئیں ان میں سے ایک یہ تھی کہ ۱۹۴۸ میں جب ریاست

(Issac Assimov) نے حساب لگا کر اعلان کیا ہے کہ ہماری کہکشاں میں چار سو ملین سیارے ایسے ہیں جن میں پودے اور حیوانات پائے جاتے ہیں یا پائے جا سکتے ہیں ۔ مگر یہ سب کا سب محض حسابی قیاس ہے ، کھربوں ڈالر خرچ کر کے روس اور امریکہ نے اس سلسلے میں جو تحقیقات کی ہیں ان کے ذریعہ اب تک زمین جیسے کسی ایک سیارے کا بھی کوئی ادنیٰ نشان دریافت نہ کیا جا سکا۔

سورج ایک اوسط درجہ کا ستارہ ہے ۔ اس کا قطر آٹھ لاکھ ۶۵ ہزار میل ہے وہ ہماری زمین سے تقریباً بارہ لاکھ گنا بڑا ہے ۔ سورج کی سطح پر جو حرارت ہے اس کا اندازہ بارہ ہزار ڈگری فارن ہائٹ ٹمپریچر کیا گیا ہے ۔

زمین سے سورج کا فاصلہ تقریباً نو کروڑ ۳۰ لاکھ میل ہے ۔ یہ فاصلہ حیرت انگیز طور پر مسلسل قائم ہے ۔ یہ واقعہ ہمارے لیے بے حد اہمیت رکھتا ہے ۔ کیوں کہ اگر یہ فاصلہ گھٹ یا بڑھ جائے تو زمین پر انسان جیسی مخلوق کی آبادکاری ناممکن ہو جائے ۔ مثلاً اگر ایسا ہو کہ سورج نصف کے بقدر ہم سے قریب ہو جائے تو زمین پر اتنی گرمی پیدا ہو کہ اس کی شدت سے کاغذ جلنے لگے ۔ اور اگر زمین اور سورج کا موجودہ فاصلہ دگنا زیادہ ہو جائے تو اتنی ٹھنڈک پیدا ہو کہ زمین پر زندگی جیسی چیز باقی نہ رہے ۔ یہی صورت اس وقت پیدا ہوگی جب کہ موجودہ سورج کی جگہ کوئی دوسرا غیر معمولی ستارہ آجائے ۔ مثلاً ایک ستارہ ہے جس کی گرمی ہمارے سورج سے اسّی ہزار گنا زیادہ ہے ، اگر وہ سورج کی جگہ ہوتا تو پوری زمین کو آگ کی بھٹی بنا دیتا ۔

نئی مطبوعات

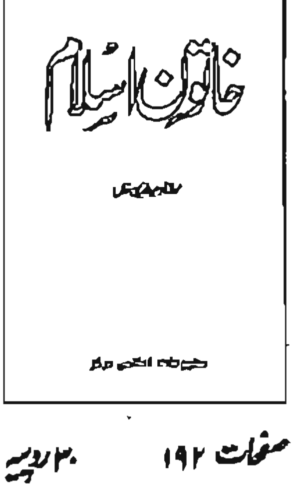

صفحات ۱۹۲ ۲۰ روپیہ

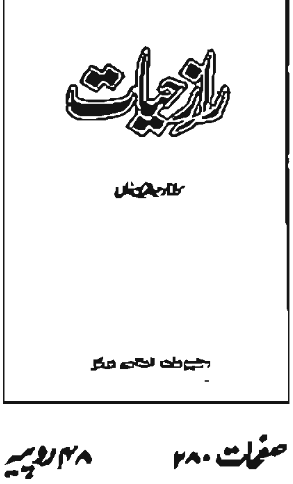

صفحات ۲۸۰ ۴۸ روپیہ

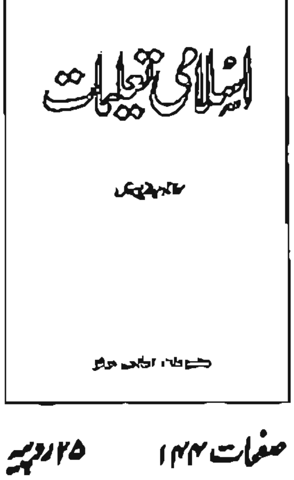

صفحات ۱۴۴ ۲۵ روپیہ

یہودی کردار

روایات میں آتا ہے کہ مدینہ میں ایک بار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس کچھ مال آیا۔ آپ نے اس کو لوگوں کے درمیان تقسیم کیا۔ اس تقسیم میں کسی کو زیادہ ملا اور کسی کو کم۔ چنانچہ اس بنا پر کچھ لوگوں نے آپ کی دیانت داری پر شبہ ظاہر کرنا شروع کیا۔ ایک صحابی کہتے ہیں :

مررت برجلین واحد هما یقول لصاحبه واللّٰه ما اراد محمد بقسمته وجه اللّٰه ولا الدار الآخرة	میں دو آدمیوں کے پاس سے گزرا۔ ان میں سے ایک اپنے ساتھی سے کہہ رہا تھا کہ خدا کی قسم محمدؐ نے اپنی اس تقسیم میں اللہ کی رضا اور آخرت کا گھر نہیں چاہا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کی خبر ہوئی تو آپ نے فرمایا: موسیٰ پر اللہ کی رحمت ہو، ان کو اس سے بھی زیادہ ستایا گیا مگر انھوں نے صبر کیا (رحمة اللّٰه علی موسیٰ لقد اوذی باکثر من هذا فصبر، تفسیر ابن کثیر، الجزء الثالث، صفحہ ۵۲۱) قرآن کی حسب ذیل آیت میں اسی کی طرف اشارہ کیا گیا ہے :

یاایها الذین اٰمنوا لاتکونوا کالذین اٰذوا موسیٰ فبرأه اللّٰه مما قالوا وکان عند اللّٰه وجیها (الاحزاب ۶۹)	اے ایمان والو، تم ان کی طرح نہ ہو جاؤ جنھوں نے موسیٰ کو ستایا پھر اللہ نے ان کی کہی ہوئی باتوں سے موسیٰ کی برارت کر دی اور وہ اللہ کے نزدیک باعزت تھا۔

یہود نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو جس طرح ستایا اس کی تفصیل بائبل کی کتاب خروج اور کتاب گنتی میں دیکھی جا سکتی ہے۔ یہودی انسائیکلوپیڈیا میں کہا گیا ہے کہ موسیٰؑ کو اپنی قوم کے باغی اور منحرف لوگوں سے بہت سی ذلت اور توہین برداشت کرنی پڑی، حتی کہ اپنے قریبی رشتہ داروں سے بھی جو کہ ان کی قیادت پر حسد کرتا تھا :

(Moses had) to suffer many indignities and insults from a rebellious and recalcitrant people, even from his closest relatives, who were jealous of his leadership.
Jewish Encyclopedia, Volume V, p. 442

یہ فرق کیوں

قرآن میں اہلِ جنّت کو دو بڑے طبقوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ ایک مقربین خاص۔ اور دوسرے عام انعام یافتہ لوگ۔ پھر بتایا گیا ہے کہ مقربین خاص کی تعداد پہلے لوگوں میں زیادہ ہوگی اور بعد کے لوگوں میں کم ہوگی۔

وکنتم ازواجاً ثلاثة۔ فاصحاب المیمنة مااصحابُ المیمنة واصحاب المشئمة مااصحاب المشئمة۔ والسابقون السابقون۔ اولئك المقربون۔ فی جنات نعیم۔ ثلة من الاولین وقلیل من الآخرین۔ (الواقعہ)

اور تم لوگ (قیامت میں) تین قسم کے ہو جاؤ گے۔ پھر دائیں والے، کیا خوب ہیں دائیں والے۔ اور بائیں والے، کیسے برے ہیں بائیں والے۔ اور آگے والے تو آگے ہی والے ہیں۔ وہ مقرب لوگ ہیں۔ نعمت کے باغوں میں۔ ان کی بڑی تعداد اگلوں میں سے ہوگی، اور تھوڑی تعداد پچھلوں میں سے ہوگی۔

اس قرآنی بیان کی تشریح کرتے ہوئے ابن کثیر اپنی تفسیر کی کتاب میں لکھتے ہیں:

لاشك ان اوّل كلّ امة خير من اٰخرها فيحتمل ان تعم الآية جميع الامم كلّ امة بحسبها۔ ولهذا ثبت فی الصحاح وغيرها من غير وجه ان رسول الله صلی الله عليه وسلم قال: خير القرون قرنی ثم الذين يلونهم ثم الذين يلونهم (الجزء الرابع، صفحہ ۲۸۴)

اس میں شک نہیں کہ ہر امت کا پہلا گروہ اس کے بعد کے گروہ سے بہتر ہے۔ اس لیے ہوسکتا ہے کہ یہ آیت حسب حیثیت تمام امتوں کے لیے ہو۔ اور صحاح اور دوسری کتب حدیث میں ایک سے زیادہ طریقوں سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، سب سے بہتر زمانہ میرا زمانہ ہے۔ اس کے بعد جو لوگ آئیں گے اور اس کے بعد جو لوگ آئیں گے۔

پہلے گروہ اور دوسرے گروہ میں اس فرق کی وجہ کیا ہے۔ اس کا جواب دیتے ہوئے ایک مفسر قرآن لکھتے ہیں: "ہر امت کے پہلے طبقہ میں نبی کی صحبت یا قرب عہد کی برکت سے

اعلیٰ درجہ کے مقربین جس قدر کثرت سے ہوئے ہیں، پچھلے طبقوں میں وہ بات نہیں رہی"۔ مگر یہ توجیہہ صحیح نہیں۔ اگر یہ فرق صحبت کی وجہ سے پیدا ہوتا تو قرآن میں یہ درج ہونا چاہیے تھا کہ دورِ اوّل کے تمام لوگ "السابقون" ہوں گے اور دورِ ثانی کے تمام لوگ "اصحاب الیمین"۔

اس کے برعکس قرآن کے مطابق "صحبت یافتہ" طبقہ میں بھی دونوں قسم کے افراد ہوں گے اور "غیر صحبت یافتہ" طبقہ میں بھی دونوں قسم کے افراد۔

اصل یہ ہے کہ یہ فرق اصلاً نوعیت ایمان کے اعتبار سے پیدا ہوتا ہے نہ کہ صرف نوعیتِ زمانہ کے اعتبار سے۔ پیغمبر کا دور دعوت کا دور ہوتا ہے۔ اس وقت جو لوگ اسلام میں داخل ہوتے ہیں وہ دعوت کے ذریعہ اسلام میں داخل ہوتے ہیں۔ وہ شعوری انقلاب کے ذریعہ اسلام قبول کرتے ہیں۔ ان کا اسلام ان کے لیے ایک دریافت ہوتا ہے۔ یہ چیز ان کو وہ برتر ایمان عطا کرتی ہے جو ان کو السابقون کی صف میں داخل کر دیتی ہے۔

اس کے مقابلہ میں بعد والوں کا اسلام نسلی اسلام ہوتا ہے۔ ان کو اسلام بطور وراثت ملتا ہے نہ کہ بطور دریافت۔ ظاہر ہے کہ وراثت والے اسلام میں وہ خصوصیات نہیں ہو سکتیں جو دریافت والے اسلام میں ہوتی ہیں۔ تاہم بعد کے دور میں بھی جن افراد کو اللہ کی توفیق سے دریافت والا اسلام حاصل ہو جائے تو وہ بھی اللہ کے نزدیک اس کے مستحق قرار پائیں گے کہ انھیں السابقون کی صف میں داخل کیا جائے۔

ایک سفر

فروری ۱۹۸۷ میں حیدر آباد کا سفر ہوا۔ یہ حیدر آباد کے لیے میرا دسواں سفر تھا۔ ابتدائی چھ سفروں کا تذکرہ الرسالہ اکتوبر ۱۹۸۳ میں شائع ہو چکا ہے۔ میرا ساتواں سفر اسلامی مرکز کی شاخ حیدر آباد کے افتتاح کے سلسلہ میں تھا۔ اس موقع پر وہاں افتتاحی جلسہ ہوا جس میں دیگر شخصیتوں کے علاوہ جناب سید مکثر شاہ صاحب اور جناب سید ہاشم علی صاحب شریک ہوئے۔ اس سفر کی روداد مقامی اخبارات (مثلاً سیاست، رہنمائے دکن، منصف ۱۲ فروری ۱۹۸۴) میں تفصیل کے ساتھ شائع ہوئی۔

حیدر آباد کے لیے میرا آٹھواں سفر جولائی ۱۹۸۵ میں ہوا۔ اس سفر کی روداد الرسالہ نومبر ۱۹۸۵ میں شائع ہو چکی ہے۔ نواں سفر جنوری ۱۹۸۶ میں ہوا۔ یہ ایک تنظیمی اور انتظامی نوعیت کا سفر تھا۔ اس موقع پر کوئی عمومی پروگرام نہیں کیا جا سکا۔ دسواں سفر موجودہ سفر تھا جو فروری ۱۹۸۷ میں پیش آیا۔

۱۳ فروری ۱۹۸۷ کی صبح کو ۶ بجے دہلی ایرپورٹ پر پہونچا تو حسب معمول ایرپورٹ پر آدمیوں کی زبردست چہل پہل تھی۔ کوئی ایک طرف جا رہا تھا اور کوئی دوسری طرف۔ کسی کے چہرہ پر سکون تھا اور کسی کے چہرہ پر اداسی۔ میں نے سوچا کہ کوئی شخص خوشی کی خبر سن کر جا رہا ہے اور کوئی شخص غم کی خبر سن کر۔ کوئی اپنے تجارتی فائدہ کی طرف جا رہا ہے اور کوئی اپنے تجارتی نقصان کی طرف۔ بظاہر ہر آدمی الگ الگ منزل کا مسافر ہے۔ لیکن حقیقت کے اعتبار سے دیکھئے تو سب کی منزل ایک ہے۔ اور وہ موت ہے۔ ہر ایک بالآخر موت کے کنارے پہونچنے والا ہے۔ مگر یہی وہ یقینی منزل ہے جس کا علم کسی کو نہیں۔

جہاز کے اندر "انفلائٹ ریڈنگ" کے لیے انڈین ایر لائنز کا ماہنامہ سواگت (فروری ۱۹۸۷) تھا۔ اس میں ایک مضمون ہندستان کے عیسائی چرچ کے بارہ میں تھا۔ اس مضمون کے ساتھ کئی تصویریں تھیں جن میں چرچ کی اندرونی تصویر بھی تھی۔ اس میں حضرت مسیح کو (نعوذ باللہ) اس حال میں دکھایا گیا تھا کہ جسم کے کپڑے اترے ہوئے ہیں اور ہاتھ پاؤں میں

میخیں ٹھونک کر آپ کو بالکل بے چارگی کے عالم میں ہلاک کیا جا رہا ہے۔

اس کو دیکھ کر مجھے یورپ کے ایک عیسائی کی بات یاد آئی۔ اس نے کہا تھا کہ مغربی دنیا میں عیسائیت کے زوال کا اصل سبب عیسائی مذہب نہیں بلکہ عیسائی چرچ ہیں۔ عیسائی چرچ ایک طرف حضرت مسیح کو خدا بتاتے ہیں۔ دوسری طرف وہ دکھاتے ہیں کہ آپ کو بے چارگی کے ساتھ صلیب پر لٹکا کر ہلاک کر دیا گیا۔ اب آج کا ایک تعلیم یافتہ نوجوان جب وسیع کائنات کو دیکھتا ہے تو اس کو یہ تصور بالکل ناقابلِ فہم معلوم ہونے لگتا ہے کہ جو خدا اتنی بڑی کائنات کا خالق و مالک ہے، وہ اس بے چارگی کے ساتھ انسانوں کے ہاتھ سے ہلاک کر دیا جائے۔

آج حیدر آباد ایک شہر کا نام ہے۔ چالیس سال پہلے حیدر آباد ایک اسٹیٹ کا نام تھا جس کا رقبہ اٹلی کے برابر تھا۔ یہاں کا نواب دنیا کا سب سے زیادہ دولت مند آدمی سمجھا جاتا تھا۔

حیدر آباد کا ابتدائی بانی سلطان قلی قطب شاہ تھا۔ وہ بہمنی سلطنت میں ایک فوجی افسر تھا۔ ۱۵۱۲ء میں اس نے بغاوت کر کے اس علاقہ میں اپنی آزاد سلطنت قائم کر لی۔ جو تاریخ میں قطب شاہی کے نام سے مشہور ہے۔ یہ سلطنت چلتی رہی، یہاں تک کہ اورنگ زیب نے ۱۶۸۵ میں اس کو فتح کر کے مغل سلطنت میں شامل کر لیا۔ اس کے بعد یہاں مغل گورنر رہنے لگے۔ نظام الملک آصف جاہ اسی قسم کا ایک گورنر تھا۔ ۱۷۱۳ میں اس کا تقرر ہوا۔ اس کے بعد اس کے اندر آزادی کے رجحانات پیدا ہوئے۔ ۱۷۲۴ میں اس نے اس علاقہ کو دہلی کی مغل سلطنت سے کاٹ لیا اور یہاں اپنی آزاد سلطنت قائم کر لی۔ غیر منقسم ہندستان میں یہ ملک کی سب سے بڑی ریاست تھی۔

ہندستان کی آزادی کے بعد سابق مسلم نواب (نظام دکن) ریاست کو سابقہ حیثیت پر باقی رکھنا چاہتے تھے۔ وہ نئی ہندستانی حکومت سے موجودہ صورت حال کی بحالی کا معاہدہ (Standstill agreement) کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ ۲۹ نومبر ۱۹۴۷ کو اس معاہدہ پر دستخط ہو گئے تھے۔ اس معاہدہ کے تحت حیدر آباد کو ایک قسم کی نیم آزاد ریاست کی حیثیت حاصل رہتی۔ مگر انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا کے مقالہ نگار کے الفاظ میں، نظام حیدر آباد کا منصوبہ ناکام ہو گیا جس کا بڑا سبب یہ تھا کہ مقامی طور پر ایک مقبول مسلم لیڈر (قاسم رضوی) نے ایک عسکری

تحریک رضاکار کے نام سے چلادی۔ اس نے ہندستان کی فوجی طاقت کو موقع دیدیا کہ وہ ریاست میں مداخلت کرکے ستمبر ۱۹۴۸ میں اس کو اپنے کنٹرول میں لے لے۔ (چار روزہ پولس ایکشن کے بعد) حیدرآباد نے دوسری دیسی ریاستوں کی حیثیت کو قبول کرلیا۔ بعد کو وہ تقسیم کردی گئی اور جغرافی نقشہ سے اس کا وجود مٹ گیا:

His plan miscarried, largely because a local populist Muslim leader launched a militant movement (the Razakars) that provided a motive for Indian military forces to intervene and restore order, in September 1948. Hyderabad accepted the same conditions as other former princely states and was later partitioned and disappeared from the map (9/423).

حیدرآباد کی مسلم ریاست ۱۷۲۴ میں اپنے مرکز سے بغاوت کے نتیجہ میں قائم ہوئی تھی۔ اور ۱۹۴۸ میں وہ خود مسلم قیادت کی نادانی کے نتیجہ میں ختم ہوگئی۔ یہی کہانی پچھلے کئی سو سال سے مسلم تاریخ میں دہرائی جارہی ہے۔ اپنے مرکز سے بغاوت کرکے اتحاد کو ختم کرنا اور پھر مزید نادانیوں کے نتیجہ میں اپنا وجود مٹا لینا ــــ حیدرآباد کا آغاز مسلم تاریخ کے ایک المیہ کو بتاتا ہے اور اس کا اختتام مسلم تاریخ کے دوسرے المیہ کو۔

پاکستان کی شائع شدہ ایک کتاب میں حیدرآباد کا ذکر کرتے ہوئے لکھا گیا ہے ــــ قائداعظم کی وفات (۱۱ ستمبر ۱۹۴۸) کی خبر سن کر تمام پاکستانی سوگ میں مصروف تھے۔ وہ شخصیت اس دنیا سے اُٹھ گئی تھی جس سے بھارتی لیڈر خائف تھے۔ اس لیے انھوں نے حیدرآباد کے خلاف فوجی کارروائی کرکے اسے زبردستی بھارت میں شامل کرلیا (تاریخ پاکستان و ہند، صفحہ ۴۷۶)

موجودہ زمانہ کے مسلمانوں نے ایسے فانی لیڈر تو پیدا کرلیے جن سے دیگر اقوام خائف ہوں۔ مگر وہ ایسے غیر فانی خدا کو نہ پاسکے جو دیگر اقوام کے مقابلہ میں ان کا مددگار بن سکے۔ کیسی عجیب ہے ان کی محرومی اور کیسی عجیب ہے ان کی کامیابی۔

شہر حیدرآباد کی ۳۰ لاکھ آبادی میں ۱۴ لاکھ مسلمان ہیں۔ یعنی کل آبادی کا تقریباً ۴۵ فی صد۔ تاہم مسلمانوں کی اس آبادی کا ۸۰ فی صد سے زیادہ حصہ قدیم حیدرآباد میں بسا ہوا ہے۔ جدید حیدرآباد میں ان کی تعداد نسبتاً بہت کم ہے۔ مسلمانوں کی آبادی کا یہی تناسب ہندستان

کے اکثر شہروں میں نظر آتا ہے۔ ہر شہر میں مسلمانوں کا حال یہ ہے کہ وہ قدیم شہر میں زیادہ ہیں اور جدید شہر میں کم۔ یہ گویا ایک علامت ہے کہ مسلمان قدیم دور میں دنیا سے آگے تھے، مگر جدید دور میں وہ دنیا سے پیچھے ہو گیے۔

موجودہ حیدر آباد کے تین بڑے حصے ہیں۔ نیا حیدر آباد، پرانا حیدر آباد، سکندر آباد۔ یہاں جو فرقہ وارانہ فسادات ہوتے ہیں وہ سب پرانے حیدر آباد میں ہوتے ہیں۔ نئے حیدر آباد یا سکندر آباد میں کوئی فساد نہیں ہوتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ نئے حیدر آباد اور سکندر آباد میں زیادہ تر پڑھے لکھے لوگ رہتے ہیں۔ مگر پرانے حیدر آباد میں معاملہ اس کے برعکس ہے۔ یہ تجربہ بتاتا ہے کہ "تعلیم" فرقہ وارانہ فساد کے خلاف ایک روک کی حیثیت رکھتی ہے۔ جو لوگ فی الواقع اس ملک میں فرقہ وارانہ فساد کو ختم کرنا چاہتے ہیں انھیں چاہیے کہ قوم کو تعلیم یافتہ بنانے کی کوشش کریں۔ جب معاشرہ کے زیادہ لوگ تعلیم یافتہ ہو جائیں گے تو فساد کا سلسلہ اپنے آپ ختم ہو جائے گا۔

پرانے حیدر آباد کا شاید سب سے بڑا مسئلہ ٹریفک کا ہجوم ہے۔ تنگ سڑکیں اور زیادہ ٹریفک، اسی کا دوسرا نام پرانا حیدر آباد ہے۔ بعض اوقات آدمی محسوس کرتا ہے کہ اگر وہ پیدل چلے تو شاید وہ سواری سے پہلے اپنی منزل پر پہونچ جائے گا۔ اس سلسلہ میں ایک صاحب نے یہاں کا لطیفہ بیان کیا۔ ایک شخص پرانے حیدر آباد کے علاقہ سے پیدل گزر رہا تھا، اتنے میں اس کا کوئی جاننے والا اپنی کار پر اُدھر سے گزرا۔ اس نے اپنی کار روک کر اس آدمی سے کہا کہ گاڑی میں آجائیے، آگے میں آپ کو آپ کی منزل پر چھوڑ دوں گا۔ آدمی نے یہ سن کر جواب دیا: آپ کا شکریہ، مگر مجھے ذرا جلدی ہے۔

حیدر آباد میں بہت سی تاریخی چیزیں ہیں جن کو دیکھنے کے لیے لوگ کثیر تعداد میں وہاں جاتے ہیں۔ انھیں میں سے ایک سالار جنگ میوزیم ہے۔ اس میوزیم میں ۴۰ ہزار سے زیادہ نادر نمونے رکھے ہوئے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ مشرقی دنیا میں یہ اپنی قسم کا واحد میوزیم ہے۔ اس کو ریاست کے ایک سابق وزیر اعظم نے بنایا تھا۔

اس میوزیم میں جو چیزیں رکھی گئی ہیں ان میں سے ایک عجیب چیز ایک سنگ مرمر کا مجسمہ ہے۔ اس مجسمہ میں ایک عورت کو اس حال میں دکھایا گیا ہے کہ وہ نہا کر غسل خانہ سے نکلی

ہے اور اس کے جسم پر بھیگا ہوا کپڑا لپٹا ہوا ہے۔ اس مجسمہ کو اس قدر فن کاری کے ساتھ بنایا گیا ہے کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سچ مچ کوئی بھیگے کپڑے میں کھڑا ہوا ہے۔ اس کو دیکھ کر میں نے سوچا: اللہ تعالیٰ نے انسان کے اندر آرٹ کو تخلیق کرنے کی یہ نادر صلاحیت شاید اس لیے رکھی ہے کہ آدمی خالق اصغر کو دیکھ کر خالق اکبر کا تصور قائم کر سکے۔

حیدر آباد کے ریاستی دور میں جو شخصیتیں ابھریں ان میں سے ایک ہیں نواب عماد الملک مولوی سید حسین بلگرامی (۱۸۴۲ -) وہ نہایت اعلیٰ تعلیم یافتہ آدمی تھے۔ اردو کے علاوہ انگریزی، فرانسیسی، عربی، فارسی زبانیں بھی بخوبی جانتے تھے۔ حیدر آباد ریاست میں وہ مختلف عہدوں پر مامور رہے۔ آخر میں وہ ناظم تعلیمات تھے۔ ۳۰ سال سے زیادہ مدت تک وہ ریاست کے تعلیمی امور کے ذمہ دار اعلیٰ رہے۔ بہت سے اعزازات و خطابات سے سرفراز کیے گیے۔ ۱۹۱۰ میں انھوں نے قرآن کا انگریزی ترجمہ بھی شروع کیا تھا۔ مگر وہ نصف قرآن سے زیادہ نہ ہو سکا۔

نواب عماد الملک نہایت صاف گو آدمی تھے۔ مولوی عبدالحق صاحب نے اپنی کتاب "چند ہم عصر" میں لکھا ہے کہ ایک دفعہ سابق نظام دکن میر محبوب علی خاں نے اعلیٰ ارکانِ سلطنت سے پوچھا کہ عوام کا ان کی نسبت کیا خیال ہے۔ ہر ایک نے تعریف کے پُل باندھ دیئے۔ نواب عماد الملک خاموش رہے۔ مکرر دریافت کرنے پر فرمایا کہ لوگ کہتے ہیں کہ آپ شراب پیئے ہوئے پڑے رہتے ہیں۔ کام کی طرف بالکل توجہ نہیں کرتے۔ نظام دکن نے ان کی اس راست گوئی کو پسند کیا اور اس کے صلہ میں ان کو الماس کی ایک بیش قیمت انگوٹھی عطا فرمائی۔

میر محبوب علی خاں کے بعد ان کے صاحبزادے میر عثمان علی خاں ۱۹۱۱ میں حیدر آباد کے فرماں روا مقرر ہوئے اور خاتمہ ریاست (۱۹۴۸) تک اس کے فرماں روا رہے۔ مولوی عبدالحق صاحب نے نواب عماد الملک کا دوسرا قصہ اس طرح لکھا ہے کہ ایک بار نواب میر عثمان علی خاں (آخری فرماں روائے دکن) نے مسئلہ ازدواج پر بحث کے دوران کہا کہ اسلام میں تعدد ازواج کے بارہ میں سہولت ہے۔ نواب عماد الملک نے فوراً ٹوکا اور کہا کہ اسلام نے اس معاملہ میں ایسی کڑی شرط لگا رکھی ہے کہ کوئی شخص ایک سے زاید بیوی نہیں رکھ سکتا۔ شاہ دکن اس